کو تباہ کر کے بسا اوقات جانی نقصان بھی پہونچایا جاتا ہے۔ ان حالات میں مرکزی حکومت، سیاسی جماعتوں کے رہنما، ملک کے باشعور طبقہ اور دانشوروں کو یہ حقیقت محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ دنیا بھر میں جس جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اس کا حقیقی روپ کتنا بھیانک ہے اور ملک میں بسنے والی سب سے بڑی اقلیت (مسلمان) جن کا ملک کی تعمیر و ترقی اور اس کی آزادی و خوشحالی میں نمایاں ترین اور قابل ذکر حصہ رہا ہے آج آزاد ہندوستان میں اور جمہوری ماحول اور فضا میں ان کے ساتھ کس طرح سوتیلی ماں کا سا سلوک اور ان کے سیاسی اور معاشی اور اقتصادی جائز حقوق کے ساتھ کس طرح کھلواڑ کیا جا رہا ہے اس صورت حال کے پیش نظر ملک کے بیس کروڑ مسلمان اپنے بنیادی حقوق کے حصول کا اعتراف کیوں کر سکتے ہیں۔؟

اب وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی کے مختلف میدانوں میں پسماندگی کے اسباب و عوامل پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اس نازک اور تشویشناک صورت حال کا حل تلاش کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور قومی حقوق کی بحالی کے لیے مثبت اور ٹھوس پروگرام وضع کیا جائے۔

ہم یہ بات پہلے بھی کہتے رہے ہیں اور آج بھی اس کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ حکمراں طبقہ کے ساتھ ساتھ ملک کے مسلمانوں کو پسماندگی کی طرف دھکیلنے میں موجودہ مسلم قیادت کی بھی برابر کی ذمہ داری ہے۔ جو محض اپنے ذاتی، پارٹی اور وقتی مفاد کو ہی ملت کا مفاد سمجھتی ہے۔ اس کی روٹی روزی کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ ملت کا سارا مسئلہ حل ہو گیا، اس لیے ہمارے خیال میں موجودہ وقت میں مسلمانوں کی سیاسی قیادت سے زیادہ معاشی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی قیادت کی ضرورت ہے۔

جنوبی ہند میں اس طرح کی قیادت ابھر کر سامنے آئی ہے اور اس نے خاصہ کام بھی کر دکھایا ہے اسے مسلمانوں کا اعتماد اور بھرپور تعاون بھی حاصل ہے لیکن شمالی ہندوستان میں اس طرح کی قیادت مفقود ہے۔

سب کچھ سیاست کے ذریعے ہی حاصل ہو جائے، اور چند سیاسی مہرے حاصل کرنے سے مسلمانوں کے مسائل حل ہو جائیں گے یہ بالکل غلط تصور ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے انقلاب نے بھی دنیا کے سامنے تعمیر و ترقی کے بے شمار دروازے کھول دیئے ہیں ان امکانات سے بھی فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے۔

تعلیم اور اقتصادیات کے ماہرین اور دانشور حضرات کو یہ بتانا چاہیئے کہ مسلمان اپنے محدود وسائل اور توانائی کو کس طرح استعمال کریں۔ عوام بھی اب محض سیاسی قائدین پر نظریں جمائے رکھنے کے بجائے خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا کر کے اپنے مستقبل کی تعمیر میں جٹ جائیں۔

شیخ رشید رضا کے سیاسی اور مذہبی افکار

(ڈاکٹر محمد راشد ندوی)

(۱)

شیخ رشید رضا ہندوستان میں بہت دنوں تک رشید رضا المصری کے نام سے مشہور تھے۔ وہ ہندوستان کے علمی اور مذہبی حلقوں میں اس صدی کی ابتدا سے متعارف رہے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی ان کی علمیت اور شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ اس تاثر کے نتیجہ میں انہوں نے ان کو ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کی صدارت کیلئے مدعو کیا۔ رشید رضا اور ان کے استاد شیخ محمد عبدہ دونوں ہی علامہ شبلی کی علمی اور دینی بصیرت سے کافی متاثر تھے بلکہ مرعوب تھے۔ جب علامہ شبلی مصر و شام کے سفر سے ہندوستان واپس ہوئے اور ان کا سفر نامہ جو سفرنامہ مصر و شام کے نام سے بعد میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک مضمون ازہر کے بارے میں عربی زبان میں لکھا جس میں انھوں نے ازہر کی صورت حال کا بڑے علمی انداز سے جائزہ لیا ہے اور اس کی صورت حال پر بے اطمینانی کا اظہار بھی درد بھرے انداز میں کیا ہے۔ یہ مضمون ہندستان ہی کے کسی عربی رسالہ میں چھپا تھا اور اس کو ۱۸۹۸ء میں رشید رضا نے اپنے رسالہ المنار اور شیخ یوسف نے المؤید میں نقل کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ عبدہ اور ان کی جماعت ازہر کی تعلیمی اور انتظامی اصلاح کے لیے رات دن کوشش کر رہے تھے۔

رشید رضا نے اپنے مذاکرات میں لکھا ہے کہ شیخ محمد عبدہ پر اس مضمون کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے ازہر کی مجلس عاملہ کے ممبران کے سامنے اس مضمون کا ذکر کیا اور اسی کی روشنی میں ازہر کی اصلاح پر ایک پُرجوش تقریر کی سلہ

اس طرح علامہ شبلی مصر اور شام میں انیسویں صدی کے اواخر میں پوری طرح روشناس ہو چکے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے جب جرجی زیدان کی کتاب التمدن الاسلامی پر تبصرہ لکھنا شروع کیا تو یہ تبصرہ المنار کے مختلف شماروں میں شائع ہوتا رہا اور بعد میں یہ الانتقاد کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ علامہ شبلی نے جب اپنے دوست رشید رضا کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تو انھوں نے خوشی خوشی اس دعوت نامہ کو قبول کر لیا اور ہندوستان تشریف لائے۔ علامہ شبلی نے رشید رضا کی آمد سے قبل ہی ان کی شخصیت کا اس طرح تعارف کرا دیا تھا کہ لکھنؤ کے لوگ ان کے دیدار کے لیے مشتاق و بے چین تھے اور جب وہ لاہور سے لکھنؤ پہونچے تو لکھنؤ والوں نے ان کا جس طرح استقبال کیا وہ لکھنؤ کی تاریخ میں کبھی بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ علامہ سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں ان کے استقبال کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔ " لکھنؤ کے اسٹیشن پر مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع جس میں علماء طلباء اور روساء غرضیکہ ہر طبقے کے اصحاب تھے۔ استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ نو بجے پنجاب میل نے اسٹیشن پر قدم رکھا تو اسٹیشن اہلاً وسہلاً مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھا۔ راجہ صاحب محمود آباد نے اپنی گاڑی ان کو سواری کے لیے بھیجی تھی اس پر بیٹھ کر وہ شہر روانہ ہوئے لیکن مسلمانوں کا جنون اتنا بڑھا ہوا تھا کہ آدھی دور کے بعد گھوڑے کھول دیئے اور خود گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے سید ممتاز

سلہ حیات شبلی۔ ص ۵۰۰

حسین بیرسٹر کی کوٹھی پر لائے جہاں سید صاحب موصوف کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔" [1]

مولانا ابوالکلام آزاد بھی رشید رضا کی خطابت اور ان کی علمیت سے کافی متاثر تھے۔ ندوہ کے اجلاس میں انھوں نے ہی رشید رضا کی عربی تقریر کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ: "اس تقریر میں ابوالکلام کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے۔ وہ رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوئے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔" [2]

رشید رضا پر مختلف دوروں میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے اور اس پر سب کا اتفاق رہا ہے کہ وہ سید جمال الدین الافغانی اور شیخ محمد عبدہ کے علمی اور فکری نظریات و افکار کی ایک کڑی ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ دراصل دونوں عظیم مفکروں کے سیاسی اور مذہبی نظریات کے مبلغ اور وکیل تھے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ عام طور سے لوگ جب کسی مفکر یا محقق کے نظریات کا مطالعہ اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ وہ کس مکتبۂ خیال کا نمائندہ ہے اور کن لوگوں سے متاثر ہے تو یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ہر فکر اور ہر علمی نتیجہ اپنے اساتذہ کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ یہ تصور میری نظر میں کسی اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ علم و فکر کی دنیا میں کسی مفکر یا محقق سے رعنائی حاصل کرنا الگ شئے ہے اور اس کے نظریات کے نقش قدم پر چلنا الگ شئے۔ اگر کوئی مفکر یا محقق اپنے استاذ کے نقش قدم ہی پر

---

[1] حیات شبلی: ص ۵۰۰

[2] ۔۔۔ شبلی: ص ۔۔۔

اسی دائرے میں خود کو محصور رکھے جس میں وہ سوچتا اور غور کرتا تھا تو اس کو کسی اعتبار سے مفکر کا مرتبہ نہیں مل سکتا۔ کیونکہ علم و فکر کے میدان میں کہیں ٹھہراؤ نہیں ہوتا اور ہر دن نئے مسائل لے کر آتا ہے اس لیے حقیقی مفکر وہی ہے جس کی نگاہیں ایک طرف اپنے ماضی کے رہنماؤں کی طرف ہوتی ہے تو دوسری طرف حال کے مسائل پر بھی وہ پوری طرح آگاہی رکھتا ہے اور آنے والے دنوں کے لیے بھی وہ خاکہ اور نقشہ تیار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مصنفین کچھ لوگوں کو اپنے اساتذہ کے دائرہ سے خارج کر دیتے ہیں اور اس کو کبھی علمی بغاوت، کبھی انحراف اور کبھی ندامت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ محمد عبدہ کے بارے میں کہا گیا کہ انہوں نے بعد میں اپنے استاذ کے طریقہ کو چھوڑ دیا تھا۔ یہی بات رشید رضا کے بارے میں کہی گئی کہ انہوں نے اپنے استاد کے ترقی پسندانہ نظریات سے انحراف کر کے قدامت پرستی اور سلفیت کی راہ اختیار کی۔ بہرصورت یہ علمی مسائل ہیں جو ہمیشہ زیر بحث رہے ہیں اور رہیں گے۔ میں آج کی مجلس میں اختصار سے رشید رضا کے افکار کا جائزہ لوں گا اور یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان کے افکار میں جو تبدیلیاں آئیں وہ بالکل حالات کے مطابق تھیں۔ کیونکہ کوئی بھی فکر حقائق کے مطابق نہ ہو تو اس کے اچھے ثمرات کبھی بھی ظاہر ہوتے۔

طلب

نو بجے پہ

رشید رضا ۱۸۶۵ء میں شام کے مشہور ضلع طرابلس کی ایک مشہور بستی قلمون

گونج اٹھا

میں پیدا ہوئے۔ یہ بستی طرابلس شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے اس

پر بیٹھ کر وہ

بستی سادات کی تھی۔ رشید رضا کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسینؓ سے

کے بعد گھوڑ

ملتا ہے۔ ان کے خاندان نے اپنے آبا و اجداد کی اعلیٰ قدروں کا ہمیشہ پاس رکھا

له ضا۔ ملت کے مسائل میں ہمیشہ پیش پیش رہے رشید رضا کے والد

سے دیکھتے تھے۔[1] دینی اور سیاسی مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے۔ رشید رضا کی ابتدائی تعلیم اپنی بستی میں ہوئی۔ پھر ثانوی تعلیم کے مرحلے میں وہ اپنی بستی کے قریبی شہر طرابلس منتقل ہو گئے۔ طرابلس شام کا بڑا مردم خیز شہر رہا ہے سمندر سے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی حیثیت اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہ علاقہ شام کا ساحلی علاقہ کہلاتا تھا۔ اور بعد میں فرانسیسی سامراج کے زیر اثر ہوا تو اس نے ملک شام کو دو حصوں تقسیم کر دیا۔ ساحلی علاقہ جس میں طرابلس اور بیروت ہے، بعد میں لبنان کے نام سے اور دوسرا علاقہ سوریا کے نام سے نئے نقشہ میں منظر عام پر آیا۔ لبنان کا علاقہ تین فرقوں میں مشتمل ہے۔ سنی مسلمان، شیعہ، علوی، اور مسیحی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس علاقہ میں جہاں مختلف اور متضاد خیال کے فرقے آباد تھے۔ انیسویں صدی سے پہلے ان میں کبھی آپس میں کوئی خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ بلکہ ہر فرقہ کے لوگوں نے آپس میں رواداری اور محبت کا ثبوت دیا۔ اور اپنے وطن عزیز سے محبت کے ساتھ ساتھ اپنے آباؤ اجداد کے ورثہ پر بھی نازاں اور فرحاں رہے۔ رشید رضا نے اپنی ذاتی ڈائری میں لکھا ہے کہ ان کے والد محترم اس علاقہ کے مسلمانوں کے دینی رہنما تھے۔ لیکن ان کے باوجود ان کا گھر علاقہ کے دوسرے فرقوں کیلئے بھی کھلا رہتا تھا۔ ان کے یہاں آنے والے مسیحیوں کے رہنما پاپ اور اہل شیعہ فرقہ کے دینی رہنما بھی ہوتے، خوشگوار ماحول میں باتیں ہوتیں اور محبت و اتحاد کا ایک صحیح ماحول قائم تھا۔[2] رشید رضا نے اس ماحول کو اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کے اثرات ان کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں رہے، چنانچہ ان کے ذاتی تعلقات ملک کے مشہور مسیحی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے بھی اتنے ہی گہرے تھے جتنے

---

[1] المذاکرات: رشید رضا۔ ص ۱۳۳

[2] المذاکرات: رشید رضا۔ ص ۱۴۳

اس علاقہ کے مسلمان علماء اور رہنماؤں سے تھے۔ ان کی دوستی علوی فرقہ کے ایک مشہور ادیب اور مفکر شکیب ارسلان سے اتنی ہی تھی جتنی کہ دمشق کے کرد علی اور حلب کے عبدالرحمن الکر سے۔ بلکہ بعض اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کے علمی اور سیاسی روابط شکیب ارسلان سے جتنے مستحکم تھے، شاید ہی کسی دوسرے معاصر سے رہے ہوں۔ شکیب ارسلان نے بھی اپنے دوست اور ساتھی کی دوستی کا حق ادا کیا اور ایک ضخیم کتاب رشید رضا کی زندگی پر لکھی جو بعد میں "السید رشید رضا واخوۃ اربعین سنۃ" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اور جو رشید رضا کی زندگی کی سب سے اہم اور مستند علمی اور سیاسی دستاویز ہے۔

رواداری کے ماحول میں پرورش پانے والے رشید رضا نے اپنے علاقہ کے لوگوں کی طرف نظر ڈالی تو انہیں بے اطمینانی کی زندگی نظر آئی۔ ایک طرف وہ طرابلس کے مدرسہ میں متداول علوم کے حصول میں مشغول تھے تو دوسری طرف اپنے علاقہ کے لوگوں کی پریشانی اور بے اطمینانی سے پریشان تھے اس طرح وہ سیاسی اور علمی میدان میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے۔ لیکن جس طرح کے علوم انھوں نے اپنے مدرسہ میں حاصل کیے، انھیں کے بقول وہ ان سے مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ اس زمانے کے مدرسوں میں جن کتابوں پر زور دیا جاتا تھا، ان کا تعلق نئے حالات سے بالکل نہیں تھا۔ جیسا کہ وہ محسوس کرتے کہ اپنے زمانہ اور ماحول سے الگ ہو کر وہ کچھ حاصل کررہے محنت کے باوجود ان علوم میں نہ انھیں زندگی محسوس ہوتی اور نہ مستقبل کے کوئی روشنی۔ لیکن بے چین ذہن کسی نہ کسی طرح تاریکی میں [illegible] حاصل کر لیتا ہے اور اپنے کرب کو دور کرنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

سلہ۔ المدرسۃ الرشدیۃ۔ مذکرات ص ۱۳۹

وہ شروع راستہ میں تنگ رہتا ہے لیکن بعد میں بڑی شاہراہوں سے ملا دیتا ہے۔ اس زمانہ میں انھیں امام غزالی کی احیاء العلوم ہاتھ آئی تو اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کتاب میں انھیں علم کی تجلی نظر آئی اور تجلی کے ساتھ ساتھ علم کی مقصدیت بھی سمجھ میں آئی امام الغزالی نے الاحیاء کو جس کیفیت کا ساتھ لکھا ہے، اس کتاب کی یہ رہی ہے جس دور میں بھی کسی نے اس کو سمجھ کر اور شہرائدہ کے ساتھ پڑھا اس میں وہی کیفیت منتقل ہو گئی۔ یہ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ الاحیاء کے مطالعہ سے رشید رضا کا ذہن طرابلس سے آگے کی طرف جانے لگا۔ گویا وہ اپنے ضلع کے ماحول سے نکل کر اپنے وطن کے ماحول میں آہستہ آہستہ منتقل ہونے لگے[1]۔ اس وقت ان کی بے چینی اور بڑھی۔ انھوں نے دیکھا کہ پورا علاقہ جو اپنے حسن و جمال، شادابی و زرخیزی کے اعتبار سے بے مثال اور بے نظیر ہے۔ اس طرح وہ تاریخ کے پھیلے ہوئے ادوار میں اس کے ہر خطہ میں علم کی شعلیں منور ہو رہی ہے۔ طرابلس، دار قیہ، بیروت، دمشق، حماۃ، حمص، حلب یہ شام کے وہ مشہور شہر ہیں جو تاریخ کے ہر دور میں روشن باب رہے ہیں۔ آج ان تمام علاقوں میں سرد مہری ہے، مایوسی ہے، بے علمی ہے، جہالت کا دور دورہ ہے۔ در عوام و حکومت میں ایک کشمکش ہے رشید رضا کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہ تھی کہ اس پورے علاقہ کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اس کی سرپرستی دولت عثمانیہ کر رہی ہے۔ لیکن کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ کی روح مفقود ہے۔ نہ راعی کو رعیت سے لگاؤ ہے اور رعیت کو راعی سے۔ یہ جہاں اس دور کی سوسائٹی کے لیے خطرناک تھی وہ آنے والے دور کے لیے بھی بڑی خطرناک ثابت ہوگی۔ کہ مسلمانوں نے جہاں ہر دور میں اپنے

[illegible]

پڑوسیوں اور ہم وطنوں سے رواداری، محبت اور خلوص کا ثبوت دیا تھا۔ آج یہ رواداری، محبت اور خلوص آہستہ آہستہ خود اپنے ہم مذہبوں سے بھی ختم ہوتا جا رہا ہے اور ملت اسلامیہ کی جگہ آہستہ آہستہ مقامی قومیتیں جگہ لے رہی ہیں جس کے مختلف اسباب ہیں۔ یہ دور جس میں رشید رضا کا علمی شعور آہستہ آہستہ پختہ ہو رہا تھا وہ دور ہے جبکہ دولت عثمانیہ مسافر نیم جاں ہو رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے ماتحت علاقوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اور ان کے حکام انتظامیہ میں ناکافی کی وجہ سے لوگوں پر جا و بے جا سختیاں کرنے لگے تھے۔ عوام کی اس ذہنی پریشانی اور کشمکش کا مطالعہ غیر ملکی جاسوس بڑی دلچسپی سے کر رہے تھے۔ چنانچہ اس کشمکش اور خلفشار کو ہوا دینے کے لیے انہوں نے ذرائع استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس علاقہ کے لوگ آپس میں عداوت و نفرت کی آگ میں جل جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اس علاقہ کے لوگوں کا باہمی اتفاق ختم ہونے لگا۔ دولت عثمانیہ سے نفرت کے ساتھ ساتھ آپس میں اس علاقہ کے فرقوں کے درمیان نفرت کی آگ سلگنے لگی اور یہ نفرت پیش خیمہ تھی اس علاقہ کی تقسیم کے لیے۔ جس کے لیے سامراجی طاقتیں تدبیریں کر رہی تھیں۔

رشید رضا انھیں کیفیات کے ساتھ اپنے علاقہ میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن ان کی پرواز بلند سے بلند تر ہوتی رہی۔ انھیں یہ معلوم ہوا کہ مصر میں ایک نئی روشنی نمودار ہوئی ہے اور یہ روشنی ایسے مفکر اور مجاہد کے ذریعہ نمودار ہوئی ہے جو نہ شامی ہے نہ مصری اور نہ ترکی ہے بلکہ وہ ایک افغانی نسل کا مرد مجاہد ہے۔ جو سرتاپا کرب ہے اور شعلۂ جوالہ جس نے مسلمانوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس راہ میں اس نے اپنی ہر چیز قربان کر دی ہے۔ وطن، گھر بار، راحت و سکون بلکہ بڑی حد تک عزت و وقار بھی۔ وہ افغانستان سے نکل کر بڑی خاموشی کے ساتھ مصر پہنچا۔ ایسا لگتا تھا کہ قدرت اس کے دل میں الہام کیا تھا